مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کے فنی محاسن

ڈاکٹر احمد اقبال پارس
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، لکی مروت

ABSTRACT:

The travelogues of Mustansar Hussain Tarar particularly relating to the Northern areas of Pakistan are well known for its literary charm and fascinating beauty. He depicted true and real pictures of the nature in his travelogues. His travelogues possesses many features, attributes and characteristics such as depiction or illustration, characterization, sketching, satire , humour, detailing, exaggeration and using of some of the poetic and literary devices which clearly distinct his literary work from the rest of Urdu literature.

کلیدی الفاظ: سفر نامہ، تصویر کشی، وجدان، سنگریزے، گلیشیئر، انگشت بدنداں

کسی منظر کی تصویر الفاظ میں کھینچنا یعنی منظر کشی کرنا بہت مہارت کا کام ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر اچھا ادیب اور نامی گرامی سفر نامہ نگار اچھا منظر نگار بھی ہو کیونکہ یہ ملکہ معدودے چند کو نصیب ہوتا ہے۔ کسی منظر، کسی مظہر، کسی پہاڑ، کسی رواں چشمے یا فطرت کے کسی رنگ کو کم سے کم اور سادہ سے سادہ الفاظ میں ایسے دلچسپ انداز میں قاری کے سامنے بیان کرنا کہ وہ اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دے، یہ صلاحیت مستنصر حسین تارڑ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ فی الواقع خارج سے داخل میں جھانک کر واقعات کی تصویر کھینچنے کا ایک انوکھا تجربہ اور ایک مثالی صلاحیت ہے۔ کرنل محمد خان مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کی منظر کشی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مجھے مستنصر کے سفر ناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے وہ ان کی فضا ہے۔ وہ دلربا سی نیم اداس فضا، نیم اداسی جو مستنصر کی نشیلی آنکھوں میں ہے اس کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اداس فضا جس میں غم کے گہرے بادل ہیں۔ نہ خوشی کی چمکدار دھوپ۔ بس دونوں کے بین بین رومانیت کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر، ریشمی سی اداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دنیا کو فتح کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف دیکھنے اور اہل دنیا کا تماشا کرنے کی آرزو ہے"۔[۱]

مستنصر حسین تارڑ کا کمال یہ ہے کہ وہ جب کسی منظر کی عکاسی کرتے ہیں تو اُس کی ذات فنا فی المظہر ہو جاتی ہے اور گرد و پیش کی ساری چیزیں اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ اس منظر، اُس مظہر کے اندرون میں جھانک کر اپنی داخلی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں گویا کسی مقام کی تصویر کشی میں اُس کا وجدان اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے

مناظر فطرت کی پیشکش میں جس ہنر مندی اور گہرے ویژن کا مظاہرہ کیا ہے اور خارج کی تصویر کشی میں اپنے وجدان کی جو قوت صرف کی ہے وہ نہ صرف قارئین کو پسند آیا ہے بلکہ اُس نے ناقدین کا منہ بھی بند کر دیا ہے۔ ''سفر خنجراب میں'' مستنصر حسین تارڑ کی تصویر کشی کا ایک رنگ ملاحظہ کریں:

> '' اور پھر دور وادی میں ایک گھر کے در و دیوار تاریکی سے الگ ہو کر جھلملانے لگے۔۔۔ آہستہ آہستہ کریم آباد کے مختلف گھروں میں دِیے جیسے خود بخود جلنے لگے۔۔ چراغاں جنگل کی آگ کی طرح تھا، پھیلتا جاتا تھا۔۔۔
>
> ''وہ اُدھر۔۔۔'' سمیر نے اُن پہاڑوں کی جانب اشارہ کیا جہاں قیمتی پتھروں کی کانیں واقع ہیں۔۔۔۔ وہاں سینکڑوں دِیے جل رہے تھے اور اُن کی روشنی سے ''یا علی'' کے حروف ظاہر ہو رہے تھے۔ اسی طرح ایک پہاڑ پر آگ کی مدد سے ایک تاج بنایا جا رہا تھا۔۔ مبارک باد کے لفظ کئی گھاٹیوں میں دکھائی دیتے تھے۔ پھر التر کی بلندی سے جیسے آگ کے گولے تیزی سے نیچے آنے لگے۔ پھر ایک اور پہاڑی سے بھی اَلاؤ نیچے آتے گئے''۔۲

مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے لکھاری ہیں جنھیں کائنات کی ہر چیز میں حسن نظر آتا ہے چاہے یہ حسن پھولوں میں ہو، پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں میں ہو، کھیت اور کھلیانوں میں ہو، جھرنوں اور چشموں میں ہو یا کسی شوخ والھڑ دوشیزہ میں ہو۔ وہ کائنات کا ہر رنگ اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔ مستنصر عورت کے حسن سے زیادہ متاثر ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُنھیں قدرت کے حسین نظاروں میں بھی عورت کا سراپا نظر آتا ہے۔ اُنھیں پہاڑ کی بلندیاں ایک محبوبہ کے روپ میں نظر آتی ہیں اور اُن کی تحریروں میں عورت کے حسن کا تذکرہ بالواسطہ

یابلا سطہ طور پر بار بار دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ جب کسی علاقے کی سیاحت پر نکلتے ہیں تو مقامی رنگوں کی منظر کشی کے ساتھ وہاں کے نسوانی حسن کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں جن سے واضح طور پر مستنصر حسین تارڑ کے ذوقِ جمالیات کا پتہ چلتا ہے۔وہ کسی منظر کا سرسری نظروں سے مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ وہ خود اس منظر میں ڈوب جاتے ہیں اور اس کے حواس خمسہ بس اسی منظر کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔اُس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اس کی اندورنی کیفیات، جذبات اور احساسات کا مظہر ہوتا ہے۔ایک موقع پر اُنہوں نے چودھویں کے چاند کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''چودھویں کا پورا چاند۔۔۔ایک سنہری تھال کی صورت۔۔۔ایک سنہری چھاج کی صورت۔۔۔ ایک ایسا چھاج جسے محبوب کو قید کرنے کے لیے۔۔ کہیں وہ چلا نہ جائے۔اس خدشے کے تحت صحن کی دیواریں اونچی کرنے کے بعد اُس کی چھاج کو بتاشوں سے بھر کر اُچھال دیا جائے۔۔۔ ایسا سنہری چھاج راکاپوشی کی اُس شب میں اُبھرتا، ہر پتھر، گھاس کے ہر تنکے، برفانی ندیوں کے پانیوں کی ہر بوند، بیس کیمپ کے اختتام پر جو گلیشیئر بچھا ہوا تھا جو اُن ندیوں کو جنم دیتا ہے۔اُس کی برفوں کی ہر کرچی کو منور کرتا تھا۔۔۔۔''[۳۳]

جس طرح ڈراموں میں کرداروں کی اہمیت مسلم ہے بالکل اسی طرح سفر ناموں میں بھی کرداروں کا چناؤ اور انتخاب انتہائی مہارت کا متقاضی ہے۔ناول،افسانے اور ڈراموں میں تو یقیناً سب فرضی کردار ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اپنی ضرورت کی بنیاد پر کردار تخلیق کرتا ہے،اُن سے جتنا کام لینا ہوتا ہے وہ لے لیتا ہے اور پھر اُسے پس پردہ کر دیتا ہے۔ سفر نامہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سفر نامہ کا تعلق حقیقی دنیا، حقیقی واقعات اور حقیقی کرداروں سے ہوتا ہے۔اُن کی ملاقات کسی نہ کسی موڑ پر سچ مچ سفر نامہ نگار سے ہو چکی ہوتی ہے اور وہ اپنی

شخصیت سے سفر نامہ نگار کو متاثر کر چکا ہوتا ہے تبھی سفر نامہ نگار اُسے اپنے سفر نامہ کا حصہ بنالیتا ہے۔

مستنصر کے سفر ناموں میں ہمیشہ دو قسم کے کردار سامنے آتے ہیں ایک مستقل کردار جو شروع سے لے کر سفر نامے کے اختتام تک چلتے رہتے ہیں اور اپنا کردار نبھاتے رہتے ہیں اور دوسرے عارضی قسم کے کردار ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت سامنے لائے جاتے ہیں یا سفر نامہ نگار خود ایسی فضا بنالیتا ہے جس میں اُس کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مستنصر کے دونوں قسم کے کردار لاجواب ہیں اور اُن کا تعلق حقیقی دنیا سے ہوتا ہے کیونکہ وہ کردار بار بار اُس کے سفر ناموں کا حصہ بنتے ہیں اور مستنصر اُن کرداروں کو مد نظر رکھ کر واقعات کو ترتیب دیتا ہے۔ عارضی کرداروں میں مستنصر بے شمار ایسے کرداروں کو متعارف کراچکا ہے جن کی وجہ سے سفر نامہ کی فضا پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں جن میں بطور خاص 'پسّو' کا ماسٹر 'حقیقت' ہے جن کا ذکر مستنصر نے متعدد سفر ناموں میں کیا ہے۔

''ہنزہ داستان'' کی ایک کردار خانم ہے جن سے مستنصر حسین تارڑ کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ خانم ایک ایرانی خاتون تھی جو اپنے بیٹے کے ساتھ تن تنہا مانسہرہ میں رہتی تھی۔ اُن کی شادی مانسہرہ کے رہنے والے ایک شخص سے ہو گئی تھی جو اُس وقت پاکستان فارن سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ مانسہر ہ میں مستقلاً رہائش پذیر ہو گئیں۔ خانم کے بارے میں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اُن کے پڑوسی اس بات کے شاہد ہیں کہ یہاں خانم نامی ایرانی عورت رہائش پذیر تھیں۔

> 'سنو لیک' میں مستنصر اچانک جاپانی عورت ''ویدہ'' کا کردار سامنے لاتے ہیں جن کی وجہ سے سفر نامے کا ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔ سب ساتھیوں کی زبان پر 'ویدہ' کا ذکر چڑھ جاتا ہے۔ اس جاپانی عورت کا کردار اتنا جاندار ہے کہ قاری اُسے برسوں فراموش نہیں کر سکتا۔ تمام اہل ٹیم فوری طور پر چیری بلاسمز کی طرح کھلے۔۔۔ اتنے کھلے کہ مرجھانے کے نزدیک

ہو گئے۔۔ جاپانی لڑکی ؟۔۔۔ کتنی عمر ہے ؟۔۔۔
جیپ میں تو جگہ نہیں ہے لیکن خیر ہم اوکھے
سوکھے ہو کر لے جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔
بیشتر جاپانیو کی طرح ایک دھیمی 'آہ' کر کے جھک
جانے والی لڑکی ویدہ۔۔۔ سیاہ جیکٹ، نیلی جین اور
پی کیپ میں ایک لڑکی اور ہمیں خبر تھی کہ بیشتر
جاپانیوں کی طرح ان ملبوسات میں بہت کچھ
پوشیدہ نہ تھا۔۔ اس کے باوجود ایک لڑکی
تھی۔۔ ۴

ڈاکٹر انور سدید مستنصر حسین تارڑ کے کردار نگاری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اس کا سفر نامہ زندگی کا مسلسل اور متحرک بیانیہ
ہے اور سفر میں تتلیوں، رنگوں اور پروں کو ہی
نہیں پکڑتا بلکہ جذبے کے مد و جزر کو بھی گرفت
میں لینے کی کوشش کرتا ہے اور سفر نامے میں
حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے زندہ کرداروں کو
بھی شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کرداروں کی وجہ
سے اکثر اوقات یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ
مستنصر شعوری طور پر ایک افسانہ تخلیق کر رہا ہے
جو ایک نقطہ سفر اور کلائمکس کی پوری قوس بنا کر
سفر کے کسی مقام پر ختم ہو جاتا ہے۔ ۵

مستنصر حسین تارڑ جہاں ایک کامیاب سفر نامہ نگار ہیں وہاں وہ ایک بہترین خاکہ نگار بھی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے سفر ناموں میں اپنے ہمراہ ساتھیوں کے ایسے زبردست خاکے کھینچے ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مستنصر سفر نامہ نگار ہیں یا خاکہ نگار ہیں۔ مستنصر کے ساتھ کے ٹو مہم پر جانے والوں میں

بظاہر سات افراد ہیں مگر یہ سات افراد بذات خود سات کہانیاں ہیں جس کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے کے رنگ میں شامل کر کے اپنی کہانی کو اور زیادہ رنگین بنا دیا ہے۔شاہد عزیز پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل ہیں جس کی ساری زندگی کورٹ روم اور قانون کی کتابوں کی ورق گردانی میں گزری ہے مگر اس وقت وہ بنفس نفیس مستنصر کے ساتھ کے ٹو کی سیر کے لیے مچل رہا ہے۔۔ مستنصر نے چند جملوں میں اس کا بڑا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے۔مستنصر کا دوسرا ہم سفر عامر ہے جس کا تعلق ایک کاروباری خاندان سے ہے اور جن کی زندگی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی ہے مگر عامر کبھی کبھار اس دائرے سے نکل کر آوارہ گردی پر نکل جایا کرتا تھا۔ مستنصر کا تیسرا اہم سفر نعمان مرزا تھا جس کا تعارف دلچسپ بھی ہے اور ادبیت کے رنگ میں رنگین بھی ہے۔

کے ٹو پر جانے والے گروپ کا چوتھا ہم سفر ایک ڈاکٹر تھا جس کے لیے باقاعدہ اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ڈاکٹر عمر اُن کا ساتھی بن گیا مگر مستنصر حسین تارڑ اور اُن کے گروپ کے ساتھ جانے کے لیے اُس نے اُن کی باقاعدہ انٹرویو کرنے کی شرط رکھی اور انٹرویو لیا بھی ایسا کہ قاری کو ان کے بارے میں جان کر ڈاکٹر کی ڈاکٹریٹ مشکوک نظر آنے لگ جاتی ہے۔انٹرویو کی ذرا ایک جھلک تو ملاحظہ کیجیئے:

> "(ڈاکٹر) کیا آپ نے کبھی خود کشی کرنے کی
> کوشش کی ہے؟
> مستنصر) جی بس اتفاق نہیں ہوا۔
> ۔۔۔کمال ہے۔۔۔ اچھا کبھی خود کشی کے بارے
> میں سوچا بھی نہیں؟
> ہاں۔۔۔۔ سوچا تو ہے۔
> سنجیدگی سے؟
> ہاں۔۔۔۔ سنجیدگی سے۔۔۔۔۔
> ڈاکٹر صاحب کھل گئے۔۔۔ پھر ٹھیک ہے میں
> آپ کے ساتھ کے ٹو کی مہم پر چلوں گا۔۔۔آپ تو
> بہت عمدہ شخص ہیں"۔ ۶؎

مستنصر کے گروپ کا پانچواں ساتھی خالد تھا۔ چھٹا ہم سفر شاہد عزیز ایڈوکیٹ کے دوست میاں فرزند علی تھے۔ ساتواں شخص خود مستنصر حسین تارڑ تھے جو کے ٹو مہم پر جانے والے گروپ کے سرخیل تھے۔ غرض مستنصر حسین تارڑ نے اپنی ٹیم میں جن کرداروں کو شامل کیا تھا وہ نارمل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک ابنارملٹی کا شکار بھی تھے۔ مستنصر نے آغاز میں اُن کا فرداً فرداً تعارف کرا کے قارئین کو ان کی نفسیات کے بارے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اِن متنوع کرداروں کی شمولیت سے سفر نامے میں ایسی جاذبیت، کشش، دلچسپی اور تحیر و سسپنس پیدا ہو گیا ہے کہ قاری گھنٹوں اس کے سحر میں کھویا رہتا ہے۔

طنز و مزاح ایک ایسا ہتھیار ہیں کہ اگر ان کا استعمال سلیقے سے کیا جائے تو اس سے نہ صرف تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تاثیر سے قاری گھنٹوں سر دھنتا ہے جبکہ اس کا بے جا استعمال طبیعت پر بوجھ اور تحریر پر ایک بدنما داغ ہوتا ہے۔ ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی اور ان جیسے دیگر ماہرینِ ادب نے طنز و مزاح کے ایسے شگوفے چھوڑے ہیں جن کی وجہ سے اُن کی تحریریں آج بھی زندۂ جاوید ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ بھی اُن نابغۂ روزگار ماہرین ادب میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کا بڑا برمحل اور برجستہ استعمال کیا ہے۔ بالخصوص سفر نامے میں اُنھوں نے ایسے انداز میں طنز کا حربہ آزمایا ہے جس سے نہ صرف سفر نامے کے حسن اور شگفتگی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس سے قاری میں اصلاح کا جذبہ عود کر آتا ہے۔ انہی حربوں اور وسیلوں سے مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے بھرے پڑے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ”سادھو کے آیا تو اس کے آس پاس پھیلے وسیع تالابوں میں سفید کنول کے ہزاروں پیالے تیرتے تھے۔ ان تالابوں کو آپ جوہڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ انگلستان میں بھی ذرا وسیع قسم کے جوہڑ ہیں جنہیں ہم لوگ بڑی عقیدت سے جھیلیں کہتے ہیں اور اِن کے کنارے کی جانے والی شاعری پر جھوم جھوم اُٹھتے ہیں۔ میں

بھی اُن پاکستانی ادیبوں میں سے ایک ہوں جو اپنے
ملک کے موسموں، پھولوں، درختوں اور اُن میں
رہنے اور اُڑنے والی مخلوق سے بے خبر ہیں۔ہم
ایران، انگلستان اور ہندوستان کے زمینی جغرافیے
سے تو واقف ہیں لیکن پاکستان کے کس خطے میں
گندم کب سنہری ہوتی ہے اور ان دنوں گندم کی
بالیوں میں کس قسم کی مہک ہوتی ہے اس بارے
میں مکمل لاعلم ہیں۔۔۔ بڑاادب صرف زمین اور
اُس کے باسیوں کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے اور
اگر آپ اُنہیں نہیں جانتے تو قلم نہ اُٹھانا زیادہ بہتر
ہے۔۔"۔ ۷

سید احمد شاہ پطرس بخاری نے مضمون "کتے" لکھ کر کتے جیسی حقیر مخلوق کو محفل کی جان بنادیا جب بھی لوگ کتے کی بات لے بیٹھتے ہیں وہاں کتے کے بارے میں پطرس کی قصیدہ گوئی و ہجو گوئی کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ یہاں مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامہ "راکاپوشی نگر" میں گدھے کی شان میں رطب اللسان ہیں اور بتایا ہے کہ جب گدھے کی رومانویت جاگ اُٹھتی ہے تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگ جاتا ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ڈھینچوں ڈھینچوں کے جواب میں ددوسرے گدھے بھی نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

"گدھے کبھی بھی کتّوں کی مانند کورس میں نہیں
گاتے بلکہ وہ انفرادی گائیکی پر یقین رکھتے ہیں۔اگر
ایک گدھا راکاپوشی کے گلیشیئر کے قریب کھڑا
ہے اور یکدم رومانوی ہو کر اپنی کسی فیورٹ گدھی
کی یاد میں تھوتھنی اُٹھا کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا
شروع کر دیتا ہے تو بقیہ گدھے جو پورے بیس
کیمپ کے طول و عرض میں خرمستیاں کر رہے
ہیں۔ وہ نہایت تحمل سے اس برادر کی آہ و زاری

سنیں گے۔ جونہی اُس گدھے کی گائیکی کے آخری
سُر مدھم ہوتے ہیں تو فوراً ہی ایک اور گدھا نغمہ
سرا ہو جاتا ہے اور بقیہ گدھے اپنے لامبے کان اُس
کی آواز کی جانب سرکا کے لطف اندوز ہونے لگتے
ہیں۔ میں آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ تمام
گدھوں کی آواز ایک جیسی ہوتی ہے، وہ ایک ہی
انداز میں بلند و آہنگ ہوتے ہیں جب کہ ہپا کن
میں اور یہاں تاگافیری کی راتوں میں اس حقیقت کا
انکشاف ہوا کہ انسانوں کی مانند گدھوں کی آوازیں
بھی مختلف ہوتی ہیں۔اُن میں کچھ کسی حد تک
سُریلے ہوتے ہیں، سُر کی پہچان رکھتے ہیں اور
اونچے سُروں میں جانے کے باوجود اُن کی آواز کی
کوالٹی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میری تحقیق کے
مطابق جو گدھے کرتوتوں کی کثرت سے قدرے
ناتواں ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ دھیمے سُروں میں اور
ذرا وقفے وقفے سے ڈھینچوں کرتے ہیں مثلاً ایک
بار ڈھیں کرتے ہیں تو اُن کا سانس ساتھ نہیں دیتا
اور وہ چُپ ہو جاتے ہیں اور پھر بہت دیر کے بعد وہ
''چوں'' کرتے ہیں۔۸؎

سفر نامہ ''سفر شمال کے'' میں مستنصر حسین تارڑ نے بیسیوں جگہوں پر نہ صرف طنز و مزاح کے رنگ بکھیرے ہیں بلکہ اپنے مخصوص اندازِ بیان کی بدولت قاری کو بار بار داد دینے پر مجبور بھی کیا ہے۔ سفر نامے کا آغاز ہی وہ ہلکے پھلکے مزاح سے کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

'' میں نیلی کار کو مکینک کے پاس لے گیا۔''اس
نے پہاڑوں پر چڑھنا ہے اسے جو کچھ کر سکتے ہو
کردو''۔

""اس کی تو بریکیں ہی نہیں ہیں خاص طور پر ہینڈ
بریک""۔مکینک کہنے لگا۔
""اور پہاڑوں پر غالباً بریکوں کی ضرورت بھی پڑ
سکتی ہے""۔ میں نے سر کھجا کر کہا۔
"" جی ہاں۔۔۔۔غالباً۔۔۔۔""
اس نے نیلی کار کی ہینڈ بریک ایسے درست کی کہ
اس کے لگتے ہی کار باقاعدہ منجمد ہو جاتی۔۔۔ ""9

مستنصر نے ""نانگا پربت میں خوش طبعی و ظرافت کے وہ گل کھلائے ہیں جن کی خوشبو چند روزہ نہیں بلکہ ان کی مہک اور خوشبو سے ہر زمانے کا قاری لطف اندوز ہوتا رہے گا اور ان کی چٹخارے دار گفتگو اور مستنصر کے ساتھ نوک جھوک سنجیدہ سے سنجیدہ قاری کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتی ہے۔ نظامی صاحب کا تکیہ کلام ""اندازہ کرو"" قاری کو بہت سے اندازے لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سفر نامہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مستنصر نے اپنے جبلی ذوق کی تسکین نظامی صاحب کے روپ میں آ کر کی ہے۔ مستنصر جہاں قاری کے لبوں پر ہنسی دوڑا رہا ہے وہاں وہ انگریزی تہذیب کو بھی اپنے طنز و تیر کا نشانہ بنا رہا ہے۔

مستنصر اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

""اندازہ کرو۔۔۔"" نظامی صاحب خوش تھے اور
بہت خوش تھے۔ ""ادھر نانگا پربت گزرتی جا رہی
ہے اور یہ میموں کی نیکریں دیکھ رہا ہے۔۔۔"" یہ
کہہ کر وہ نشست سے اُٹھے اور دوسری قطار کی
آخری نشست پر براجمان، ایک ادھیڑ عمر، تھل
تھل کرتی، کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے، نانگا
پربت کو تلاش کرتی، میم پر جا جھکے۔
""ایکسکیوز می۔۔۔۔ وہ مسکرائے۔ میم نے ناک ہٹا
کر اُنہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ کیا میں نانگا پربت دیکھ
لوں؟"" نظامی صاحب کی نظریں کھڑکی پر نہیں

تھیں بلکہ میم کے فراخ اَن ڈھکے بوڑھے سینے پر
تھیں۔۔۔۔۔۱۰؎

چھوٹی سے چھوٹی بات پر نظر رکھنا، بات میں سے بات نکالنا اور اپنی باتوں کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جو لوگ محفلوں میں بیٹھے ہوتے ہیں، جنہوں نے زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا ہوتا ہے، جن لوگوں کا مشاہدہ قوی اور نظر دور رس ہوتی ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئے ہوتے ہیں تو اُن کو یہ سلیقہ آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا شمار بھی اُن ہمہ رنگ اور ہمہ گیر شخصیات میں ہوتا ہے جو ''عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں'' کے مصداق ہوتے ہیں۔ مستنصر کو بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے، وہ بات میں سے بات نکالنا کا گر جانتے ہیں،اُن کے پاس زندگی کا تجربہ ہے،انسانوں کا تجربہ ہے، برفیلے پہاڑوں کا تجربہ ہے۔ وہ پتھروں، سنگریزوں، جھرنوں، بیابانوں، گلستانوں اور پھولوں کے شگوفوں تک سے باتیں کرتا ہے اور جب وہ ان سب رنگوں کو اپنے وجود میں سمو کر ان کا اظہار کرتا ہے تو الفاظ سچے موتی بن کر اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اور فوراً دل پر اثر کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ میں یہ صفت ہے کہ وہ عام کو خاص بناتے ہیں اور خاص بنا کر اُس کی ایسی فلسفیانہ توجیہہ کرتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان کا مشاہدہ جتنا قوی ہو گا اور جتنی باریک بینی سے وہ عام اشیاء کا مطالعہ کرے گا اُتنا ہی زیادہ اُس پر اُس چیز کی نئ جہتیں اور نئے زاویے آشکارا ہوں گے۔ مثلاً سیب عام پھل ہے جسے سب لوگ جانتے بھی ہیں اور اسے استعمال بھی کرتے ہیں۔ بے شک اس کے طبّی فوائد ہیں مگر طبّی فوائد سے قطع نظر مستنصر نے سیب کے درخت کو عام سے خاص کر کے اسے رومانوی شہرت کا منبع قرار دیا ہے اور اس کی مہک میں اہل دل لوگوں کے لیے ایک سندیسہ بتایا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

'' سیب کے درخت اپنی رومانی شہرت اور ادبی
دلکشی سے سراسر الگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ادب
میں گالزوردی کے ''سیب کا درخت'' کے اسیر
ہوتے ہیں اور قاضی عبدالغفار کے ترجمے سے کسی

اور جہان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔۔۔ وہ جب
اصل زندگی میں سیب کے درختوں کو دیکھتے ہیں تو
نہایت دل برداشتہ ہوتے ہیں۔۔۔ اس لیے کہ
سیب کے درخت زیادہ پرکشش نہیں ہوتے بلکہ
کسی حد تک درخت ہی نہیں ہوتے بلکہ واہیات اور
بے ڈھنگے سے کچھ ہوتے ہیں لیکن یہ اُن کی مہک
ہوتی ہے جو اُنہیں سب سے جدا کرتی ہے۔ اُن کی
مہک میں ایک عجیب سا سندیسہ ہوتا ہے۔۔ جو
صرف اُن تک پہنچتا ہے جو مہک کی طاقت سے آگاہ
ہوتے ہیں۔"[۱۱]

مستنصر حسین تارڑ اپنی نثر کو سحر آفریں اور دلنشیں بنانے کے لیے مختلف وسیلوں کا سہارا لیتے ہیں کبھی وہ اپنی رنگین نثر سے قاری کا دل مٹھی میں کرتے ہیں تو کبھی وہ اشعار کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو دلچسپ اور جاذب نظر بناتے ہیں۔ وہ ایسی ہنر مندی سے نثر میں اشعار کا استعمال کرتے ہیں جیسے کسی ماہر کاریگر نے کسی ہار میں نگینے پروئے ہوں یوں وہ قاری کو سیاحت کے مزے لوٹنے کے ساتھ ساتھ اشعار کے مزے سے بھی آشنا کر دیتے ہیں نتیجتاً قاری تخلیق کار کی فنکارانہ پختگی کا دل سے قائل ہو کر اُسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مستنصر کے اُسلوب کا یہ پہلو اُس کے جمالیاتی ذوق کا مظہر ہے۔ وہ اشعار کی میناکاری سے اپنے اُسلوب کو ایسا جاندار بنا دیتے ہیں کہ قاری کو سر اُٹھانے اور ادھر اُدھر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو کر، تحریر کی لذت میں کھو جاتا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"جھیل میں پانی کی سیڑھیاں ہیں جو میرے بوجھ
سے کھلتی جاتی ہیں اور میں کوشش میں ہوں کہ اُن
کی تہہ کو چھولوں۔۔۔ یہ سیڑھیاں قدموں سے نا
آشنا ہیں اور ہر سیڑھی پر میرا نام لکھا ہے اور میں
تہہ سے ٹکرا جاتا ہوں۔۔۔ میرا بدن پھِسل جاتا

ہے اور مجھے سانس نہیں آرہا اور اس خوابِ مسلسل
کا کوئی انجام نہیں۔
ے خواب میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اُس کا بتانا
مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا
مشکل ہے ۱۳؎

قصے کہانی میں جب تک مبالغے کا عنصر شامل نہ ہو اُس وقت تک وہ پھیکی دال کی طرح لگتی ہے مگر حد سے زیادہ مبالغہ آرائی بھی قصے کہانی کے وجود کو ریت کا گھروندہ بنادیتی ہے جو معمولی دھکے سے دھڑام سے گر جاتا ہے۔ لہذا مبالغہ کے استعمال میں اعتدال اور میانہ روی بہت ضروری ہے۔ مستنصر حسین تارڑ پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ سفر نامہ لکھتے ہوئے حدِ اعتدال بھول جاتے ہیں اور کسی منظر، کسی شخص یا کسی واقعہ کے بیان میں اتنی زیادہ مبالغہ آرائی کر جاتے ہیں کہ اس سے نہ صرف نثر پارے کی ادبیت مجروح ہو جاتی ہے بلکہ اُس کی بات جھوٹ کی حدود کو چھو لیتی ہے۔ حالانکہ یہ سراسر الزام ہے جس میں کوئی صداقت نہیں۔ مستنصر کے ہاں مبالغہ آرائی ضرور ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ اس سے کسی ادب پارے کا ادبی حسن مجروح ہو۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہاں تشبیہات کا ایک وافر ذخیرہ ہے۔ استعارات و کنایات کا ایک وسیع سمندر ہے۔ اُس کے پاس ایک فلسفیانہ فکر ہے۔ اُس میں اشیاء کا موازنے کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اُس کی ذہنی سطح اتنی بلند اور اتنی ہمہ جہت ہے کہ وہ کسی چیز کو بیسیوں زاویے سے پرکھتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو جذبات کی آنچ دے کر قاری کے سامنے ایسے تقابلی انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری نہ صرف اُس کی گہرائی و گیرائی کو سمجھ جاتا ہے بلکہ وہ متنوع موضوعات سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔

سفر نامہ شمشال بے مثال میں ایک جگہ پر مستنصر حسین تارڑ نے کوہ قارون کا ذکر کیا ہے جو بذات خود ایک تاریخی حوالہ رکھتا ہے اس پر مستزاد کہ کوہ قارون کو تبت کے مقدس کوہ کیلاش سے تشبیہہ دے کر نہ صرف خود اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے بلکہ قاری کوہ کیلاش کا نام سن کر اس کی تاریخی اہمیت جاننے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے 'سنولیک' کا آغاز بڑے رومانوی انداز میں کیا ہے اور مستنصر کے ہاں رومان کا آغاز عورت کے حسن و جمال سے شروع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے 'اسکولے' کی عورتوں کے بدن کو یاک کے دودھ سے تشبیہہ دے کر اُن کے حسن کو وہ خراج تحسین پیش کیا ہے جس کی مثال اُردو ادب میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے اور اسی پر بس نہیں، مستنصر کہتا ہے کہ ان عورتوں کے حسن سے صرف اپنی آنکھیں ہی ٹھنڈی کی جاسکتی ہیں ان کو چھوا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ عورتیں اتنی نازک اندام ہیں کہ انسانی ہاتھوں کی لمس سے اُن کے دودھیا بدن پر نیل پڑتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں ادب کا ہر وہ حربہ آزمایا ہے جس سے کسی تحریر کے ادبی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔اس میں افسانوی رنگ بھی شامل ہے اور ناول کی طرح اس میں متعدد کہانیاں بھی جنم لیتی ہیں۔اس میں ڈرامائی انداز بھی موجود ہے اور مکالماتی تکنیک کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔جاسوسی ناولوں کی طرح تحیر و سسپنس بھی موجود ہے اور کسی ماہر مصور کی طرح منظر نگاری کے رنگوں سے بھی مزیّن ہے۔ان تمام اوصاف کے امتزاج سے مستنصر کا سفر نامہ تخلیق ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری اُن کے سفر نامے پڑھ کر اطمینان کا ایسا گہرا سانس لیتا ہے جیسے کسی تشنہ لب شخص کو ویرانے میں ٹھنڈا پانی میسر آیا ہو جس کی تشنگی بالکل ختم ہو گئی ہو۔

> " کیا کہا ہے میڈم؟"
> " یہ دلال کا بچہ کہتا ہے کہ تم تارڑ کے ساتھ ہنس کر بات کیوں کرتی ہو۔
> کوئی بات ہے اور یہ جو اے سی صاحب اور ایس پی صاحب اس کے واقف ہیں یہ ان کے ساتھ تمہارا سودا کر رہا ہے۔ یہ ایک عجیب اعزاز تھا جو زندگی میں پہلی بار مجھے نصیب ہو رہا تھا۔۔
> " کیوں شیخ صاحب۔۔۔"
> شیخ صاحب ایک ناتواں مرغی کے ہاتھوں بے عزت ہونے والے اصیل مرغ کی طرح سینہ

پھلائے اپنی شرمندگی کو چھپانے کی کوشش
کررہے تھے۔ اُنہوں نے کرسی سے اُٹھ کر اس
منحنی سینے پر ہاتھ مار کر کہا ''لو جی ہم بھی کوئی قلی
نہیں ہیں۔'' ''سر میں نے تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا
کہ آپ قلی ہیں۔ قلی تو ریلوے سٹیشنوں پر ہوتے
ہیں ''۱۳

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا فکری و فنی جائزہ لے کر یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ اس کے سفر ناموں میں تمام تر ادبی محاسن نہ صرف بدرجہ احسن موجود ہیں بلکہ ان ادبی محاسن کی رعایت نے ان کے سفر ناموں کو اتنا جاذب نظر، پر کشش اور دلچسپ بنایا ہے کہ قارئین ان کے سفر ناموں کو چٹخارہ لے لے کر پڑھتے ہیں اور انھیں دل کھول کر داد دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مجموعہ مستنصر حسین تارڑ مشمولہ، ''اندلس میں اجنبی'' دیباچہ از کرنل محمد خان، ص: ۲۹۰
۲۔ سفر شمال کے، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۲۱
۳۔ راکاپوشی، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۱۳۸
۴۔ سنولیک، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۶۵
۵۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۸۹۱ء، ص: ۳۵۷
۶۔ کے ٹو کہانی، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۲۰
۷۔ سفر شمال کے، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۱۷
۸۔ راکاپوشی، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۱۶۵

۹۔ سفر شمال کے، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۱۵

۱۰۔ نانگاپربت، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۱۲

۱۱۔ یاک سرائے، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۷۲

۱۲۔ایضاً ،ص: ۳٦

۱۳۔ چترال داستان، مستنصر حسین تارڑ، ص: ۲۱۴